مطبوعات

الحسین | مؤلفہ جناب ابوالنصر۔ مترجمہ: شیخ محمد احمد پانی پتی۔ شائع کردہ: مکتبہ جدید، انارکلی، لاہور۔ قیمت مجلد معہ گرد پوش ۸ روپے۔

حضرت حسین ابن علی رضی اللہ عنہما، واقعۂ کربلا، اور اس واقعہ کا وسیع پس منظر ہماری تاریخ کے اہم موضوعات میں سے ہیں۔ پھر چونکہ ان موضوعات کے بارے میں جمہور اہل سنت، شیعہ حضرات اور خارجی گروہ کے درمیان شدید اختلافات ہیں، ہر کسی نے تاریخ کی تعبیر اپنے انداز سے کرنے کی کوشش کی ہے، اس لیے تاریخ کے یہ ابواب اہمیت کے ساتھ ساتھ اچھی خاصی پیچیدگی بھی اپنے اندر رکھتے ہیں۔

اس فتنوں بھرے دورِ تاریخ کا ریکارڈ ایک طرف تو جمہور مسلمین کے خلاف شیعہ و خوارج کے صف آرا ہو جانے کی وجہ سے بے شمار غلط فہمیوں اور مبالغہ آرائیوں سے بھرا پڑا ہے اور دوسری طرف اس میں کام کرنے والی شخصیتیں ایسی عظمت مآب ہیں کہ حقائق کا تجزیہ کرنے میں مؤرخ اور سوانح نگار بڑی مشکل میں پڑ جاتے ہیں یہی صورت کارنامۂ حسینؓ کے مؤرخین کو پیش آتی ہے۔

اس موضوع پر زیرِ نظر کتاب بظاہر بڑے محققانہ عزائم کے ساتھ لکھی گئی ہے، لیکن ان عزائم کے باوجود مثبت پہلو سے کوئی بڑی ندرتِ فکر سامنے نہیں آئی اور نہ واقعات کا مطالعہ و تجزیہ کسی مختلف اسلوب سے کیا گیا ہے۔ تاہم یہ کتاب ایک گونہ علمی مرتبہ رکھتی ہے اور تیسرے درجے کے مضمون نگارانہ انداز کی چیز نہیں ہے۔

اس کے اوّلین اوراق کو پڑھنے سے آدمی اس غلط فہمی میں پڑ جاتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت یافتہ مسلم سوسائٹی میں خلافت کے مسئلے کو اس طرح لیا گیا تھا جیسے کسی متوفی کی جائداد کے استحقاق کا مسئلہ موجبِ نزاع بنا ہوا ہو اور جاہ طلبوں کے مختلف گروہ ایک دوسرے سے کشمکش کر رہے ہوں جیسے نظامِ امارت و حکومت کے بارے میں کتاب و سنت نے سرے سے کوئی رہنمائی نہ دی ہو اور کسی اصولی ہدایت کا سروسامان نہ کیا ہو۔ سقیفہ بنو ساعدہ کے اجتماع کی جن بحثوں کو عام کتابوں کی طرح اس کتاب میں بھی غیر معمولی حیثیت کا حامل قرار

دیا گیا ہے، وہ درحقیقت دنیا کی کسی پارلیمنٹ اور شوریٰ کی اس موضوع پر ہونے والی معمولی بحثوں سے مختلف نہیں ہیں، اور اس مجلس کی برتری اور اس کے شرکاء کی صاف دلی کا روشن ثبوت یہ ہے کہ ذرا سے وقفے میں معاملہ سلجھ جاتا ہے۔ کہا گیا ہے کہ یہ مسئلہ متفقہ طور پر حل نہ ہو سکا۔ حالانکہ کسی اقلیت (بلکہ دو چار افراد) کے اختلاف کے باوجود جمہوری و شورائی نظام میں زعماء کی عظیم اکثریت جس فیصلے پر جمع ہو جاتی ہے اسے انسانی زبان میں ہمیشہ متفقہ فیصلہ کہا جاتا ہے۔ مؤلف کی نگاہ میں حضرت علی اپنے رفیقِ مسلک حضرت ابوبکر صدیق کی خلافت کو برحق ماننے پر اپنے آپ کو کبھی تیار نہ کر سکے۔ مگر تاریخ کا کوئی محقق اس بات کو قبول نہیں کر سکتا۔ حضرت علیؓ کا اختلاف عارضی تھا اور بعد میں آپ نے اپنا فرائض تعاون امیر المؤمنین کے سامنے پیش کر دیا۔ تاہم مؤلف ذاتی طور پر خلافت کے نظریۂ شورائی ہی کے قائل ہیں، جیسا کہ صفحہ ۱۵ کے پہلے پیراگراف سے واضح ہے۔

مؤلف کی اس رائے سے ہم اتفاق کرتے ہیں کہ شخصی بادشاہت کا دور شروع ہو جانے کے بعد حکمرانوں کو "خلیفہ" کا نام دینا اس اصطلاح کا نہایت غلط استعمال ہے۔ اور ہم اس سے بھی اتفاق کرتے ہیں کہ جناب معاویہ ہی کے ہاتھوں شخصی بادشاہت کا دروازہ کھلا ہے، چاہے ان کی نیت کتنی نیک ہو اور چاہے ان کے اقدام کو اجتہادی غلطی قرار دیا جائے۔ اس سلسلے میں مؤلف نے یہ دکھایا ہے کہ حضرت علی کا ذہن صدفی صد دینی تھا اور ان کے مقابلے میں امیر معاویہ کا اندازِ فکر سیاسی تھا۔ یہ تقابل بہت قابلِ غور ہے۔ امیر معاویہ جو دورِ خلافت اور دورِ ملوکیت کی درمیانی کڑی ہیں اور بہت سے وجوہ سے مسلمانوں کی نگاہ میں قدر و قیمت بھی رکھتے ہیں، مؤلف نے ان کا مؤرخانہ احتساب کرتے ہوئے بعد کے مصائب کی ذمہ داری ان پر ڈالی ہے۔ (ص ۵۰۰)

امام حسینؓ کی سرگزشت جس طرح بیان کی گئی ہے، فی الجملہ وہ مطابقِ واقعہ ہے۔ سلسلۂ واقعات کا یہ پہلو بہت ہی قابلِ غور ہے کہ آپ جب کوفہ کے ارادے سے نکلتے ہیں تو آپ کے تمام محب اور خیر خواہ آپ کو باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ لیکن ان سب کے مشوروں کے جواب میں امام حسین کی طرف سے جو باتیں کہی گئی ہیں ان میں سے کوئی بھی سیاسی استدلال پر مبنی نہیں اور نہ حالات کے جائزے کی روشنی میں رویہ تجویز کرنے کا اندازِ فکر ان باتوں میں ملتا ہے۔ بلکہ جیسے ایک وجدانی جذبہ ہے جس میں سرشار ہو کر آپ مشہد کی طرف بڑھتے چلے جا رہے ہیں، جیسے تقدیرِ الٰہی آپ کے قافلے کی عناں بردار ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ آپ کوفہ والوں

کے طرزِ عمل کو دیکھ کر حالات کو اپنے ہاتھوں بدل ڈالنے سے مایوس ہو کر اس فیصلے پر پہنچ گئے تھے کہ اب سوئی ہوئی امت کو جھنجھوڑ دینے کے لیے تنہا اپنی جان کی بازی وقت کے فتنہ کے خلاف لگا دینی چاہیے اور اپنے خون کے قطروں کے بیج تاریخ میں ڈال دینے چاہئیں جو ابد میں برگ و بار لا سکیں اور جن کے ذریعے اس امت میں حق کی حفاظت اور باطل کی مزاحمت کے جذبات زندہ رہ سکیں۔ اس فیصلے کے پس منظر میں آپ کا جو اصولی نقطہ نظر کام کر رہا تھا وہ کوفہ والوں کے نام ایک خط میں آپ نے پیش کر دیا یعنی "امام (صدرِ حکومت) وہ ہونا چاہیے جو کتاب اللہ پر پوری طرح عمل کرنے والا ہو، عادل ہو، اور دینِ حق کا فرماں بردار ہو" معاملہ ذاتی یا خاندانی اقتدار کا نہ تھا کہ رسول اللہ کی گدی آپ کے بال بچوں کو میراث میں ملنی چاہیے۔ ساری بازی اسی اصول کے لیے لگائی گئی۔

آپ آگے بڑھتے ہیں، ساتھی جو آ آ کر ساتھ ہو گئے تھے آہستہ آہستہ چھٹتے جاتے ہیں، یہاں تک کہ شہادت گاہ میں آ پہنچتے ہیں۔ پہنچنے سے لے کر شہادت کی آخری ساعت تک جو گفتگوئیں آپ نے مخالفین سے کی ہیں اور جو تقریریں فرمائی ہیں ان کے ایک ایک بول سے پتھر بھی پانی ہو کر بہہ سکتا ہے، مگر وہ جانے کیسے انسان اور کیسے مسلمان تھے جن کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی بلکہ بے رحمی سے لڑے، نہایت بزدلانہ طریق سے عورتوں اور بچوں پر ظلم ڈھائے، پانی بند کرنے کی ذلیل کارروائی کی، اور پھر درندوں کی طرح امت کے عظیم ترین نوجوان پر جھپٹ پڑے، حد یہ کہ اسکی لاش کو گھوڑوں کے سموں سے روندا —— اور یہ سلوک اہلِ اسلام نے کبھی بدترین کفار کے ساتھ بھی روا نہ رکھا تھا۔ یہ حالات پڑھ کر آدمی کا سر چکرا جاتا ہے کہ حکومت جب معاشرے کو بگاڑنے پر تُل جاتی ہے تو آناً فاناً بگاڑ کہاں تک جا پہنچتا ہے۔ کوئی نہ تھا جسے وقتی اشتعال ہی آ جاتا، کوئی نہ تھا جو ہمہ تن احتجاج بن کر اٹھ کھڑا ہوتا۔ ڈر اور لالچ، دو عوامل نے اکابر و عوام سب کو حکومت کا بے بس آلۂ کار بنا دیا تھا۔ دوسری طرف اس گرداب بلا میں آئے ہوئے امام اور ان کے ساتھیوں نے جس شجاعت کا مظاہرہ کیا ہے اس کی مثالیں نایاب ہیں۔ تاریخ نگاروں نے بعض مصالح کے تحت قتل حسین کی ذمہ داری کا تمام تر بوجھ یزید کے بجائے ابن زیاد اور شمر کے سر ڈالا ہے۔ اس کتاب میں بھی یہی نقطہ نظر بطور روایت دہرایا گیا ہے۔ لیکن حکمران ان تمام واقعات و حوادث کا ذمہ دار ہے جو اس کے نمائندوں کے ذریعے اس کی حدودِ سلطنت میں نمودار ہوتے ہیں۔ اور پھر یزید کے ذہن و اخلاق کو سامنے رکھیں تو کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس کا دفاع کیا جائے۔ محض یہ بات یزید کو سندِ تقدس نہیں دے سکتی

کہ اس کو ایک صحابی نے نامزد کیا ہے۔ یزید پر قتلِ حسین کی پوری پوری ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور وہ اس کے لیے خدا کے سامنے جوابدہ ہوگا۔

اس داستانِ درد کا ایک اہم رُخ ہے جو واعظوں اور مقرروں اور ذاکروں اور شاعروں نے بالکل اوجھل کر دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ امام حسین نے آخر دم تک اس بات کی سعی کی کہ مسلمانوں کے اندر ان کی وجہ سے جنگ و جدال نہ ہونے پائے۔ چنانچہ تین صورتیں آپ نے ابن زیاد کے سامنے رکھیں: ایک یہ کہ جہاں سے آپ آئے ہیں وہیں لوٹ جائیں، دوسرے یہ کہ کسی سرحدی علاقے کی طرف چلے جائیں، تیسرے یہ کہ آپ کو یزید کے پاس لے جایا جائے اور بالمشافہ اپنا معاملہ طے کریں۔ لیکن ابن زیاد اور شمر نے ان تینوں صورتوں کو مسترد کر کے اپنی قسمت میں لکھے ہوئے سنگدلانہ اقدام کو پورا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ گویا امام حسین کی طرف سے حجت ہر طرح پوری ہو گئی۔

مؤلف نے تاریخ کے اس خونیں باب کے مطالعہ کے ذریعے قارئین کو جس نتیجہ تک پہنچانا چاہا ہے وہ عجیب ابہام اپنے اندر رکھتا ہے۔ استنتاج کی فصل کا عنوان ہے "وحدتِ اسلامی کی اپیل"۔ اس فصل میں اگرچہ "اعلائے کلمۃ الحق" اور "اسلام کے جھنڈے کو سربلند رکھنے" کی کوشش کے الفاظ بھی ملتے ہیں لیکن مغزِ کلام یہ ہے کہ امام حسین مسلمانوں کو تفرقہ و اختلاف سے بچانے کے لیے اُٹھے تھے، کیونکہ یزید کی حکومت پر مسلمانوں کا جمع ہونا ممکن نہ تھا اور آپ کی ذات سب کا مرجع اعتماد بن سکتی تھی۔ چنانچہ کتاب کا مقصد آخری سطر میں یوں بیان کیا گیا ہے کہ "مسلمانوں میں باہمی اتحاد کی سچی تڑپ پیدا ہو جائے"۔ ہم صاف صاف عرض کریں گے کہ شہادتِ حسین کا اصل سبق یہ ہرگز نہیں ہے۔ وہاں سے تو ایک سبق یہ ملتا ہے کہ مسلمان گروہ کو کبھی بھی کسی غیر اسلامی یا فاسد نظامِ حکومت کے تحت مطمئن ہو کر نہیں بیٹھ رہنا چاہیے، بلکہ اس کی اصلاح کے لیے جدوجہد کرنا چاہیے، دوسرا سبق یہ ملتا ہے کہ اگر حالات کی اصلاح کے لیے منظم تحریک کو آگے بڑھانے میں عوام کی بے حسی مانع دکھائی دے تو چند شخصیتوں کو اپنی جان کی بازی لڑا کر اس خوابیدہ حس کو جھنجھوڑنا لگانا چاہیے۔ اور تیسرا سبق یہ ملتا ہے کہ با اصول اور خوددار آدمیوں کو سچائی پر قدم جماتے ہوئے ہر قسم کے ظلم و تشدد کو ہمت و شجاعت سے برداشت کرنا چاہیے۔ افسوس ہے کہ کتاب ان اصل اسباق کو سامنے نہ لا سکی۔

اس تنقید سے مقصود کتاب کی تنقیص نہیں ہے۔ فی الجملہ یہ کتاب خاصی محنت سے لکھی گئی ہے۔ زبان بھی مناسب ہے، اور خوبصورت ٹائپ میں اچھے کاغذ پر چھپی ہے۔ ترجمہ بھی اچھا معلوم ہوتا۔